



## اصطلاحات

### مفتی منیب الرحمن

ہمارے ہاں بجٹ کے موقع پر، اُس سے پہلے اور بعد معاشی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں، اُن میں سے چند یہ ہیں:

(الف) فی کس آمدنی: اسے Per Capita Income کہتے ہیں، اس سے مراد یہ ہے کہ ملک کی کل آمدنی کا تخمینہ لگا کر کل آبادی پر تقسیم کر دیا جائے، یعنی کل آمدنی مقسوم (Devidend)، کل آبادی مقسوم علیہ (Devvisor) اور جو جواب آئے، وہ فی کس آمدنی کہلاتی ہے۔ اس سے ہرگز یہ مراد نہیں ہے کہ واقعی ہر شہری کو کل آمدنی میں سے اس کا برابر حصہ مل جاتا ہے، یہ فقط ممالک کی معاشی استعداد کو ماپنے کا ایک فارمولہ یا ذریعہ ہے، درحقیقت اس آمدنی کا اتنی فیصد پر کلاس کے چند ہاتھوں میں ہوتا ہے اور نڈل کلاس اور لوئر کلاس کے طبقات کو، جو ملک کی آبادی کا پچانوے فیصد ہوتا ہے، باقی تقریباً بیس فیصد ملتا ہے، اس کی تقسیم بھی مساوی نہیں ہوتی، بلکہ اس میں بھی درجات کا تفاوت موجود ہوتا ہے، الغرض زیریں طبقات کُلی یا جزوی طور پر طبقہ محرومین (Deprived) کہلاتے ہیں۔ عالمی اعداد و شمار میں کسی ملک کی فی کس آمدنی کو ڈالروں میں سالانہ یا یومیہ آمدنی کے طور پر دکھایا جاتا ہے، یہ سب الفاظ کی شعبہ بازی ہوتی ہے، یہ سب اعداد و شمار حقیقت سے کوسوں دور ہوتے ہیں۔ تخمینہ لگانے میں ایک اور نقص یہ ہے کہ فرض کریں ڈالر ایک سو چالیس پاکستانی روپے کے برابر ہے، مگر اب صورت حال یہ ہے کہ ایک امریکی ڈالر کی قوت خرید ایک سو چالیس پاکستانی روپے کی قوت خرید سے زیادہ ہے، اس لیے اب مطالبہ کیا جا رہا ہے کہ Purchasing Power Parity Per Capita Income یعنی ڈالر کے مقابلے میں مقامی کرنسی کی قوت تبادلہ کے بجائے قوت خرید کو فی کس آمدنی کے لیے معیار بنایا جائے، اس نظریے کے علم برداروں کے بقول اس سے فی کس آمدنی حقیقت سے قریب تر ہو جائے گی، واللہ اعلم بالصواب۔

(ب) مجموعی قومی آمدنی: اسے انگریزی میں Gross Domestic Product کہتے ہیں، یعنی ملک کے اندر جو کل پیداوار ہوتی ہے، خواہ افرادی ہو، کمپنیوں اور کارپوریٹڈ اداروں کی ہو، اس میں بین الاقوامی کارپوریٹ اداروں (Multinational Enterprise) کی آمدنی بھی شامل ہوتی ہے، جو وہ کسی ملک کی حدود میں کماتے یا پیدا کرتے ہیں۔ وہ اپنا منافع یا تو اُسی ملک کے اندر مزید سرمایہ کاری اور کاروبار بڑھانے میں استعمال کرتے ہیں یا واپس اپنے ملک لے جاتے ہیں اور کبھی اپنا کاروبار فروخت کر کے پورا سرمایہ سمیٹ کر اُس ملک سے نکل جاتے ہیں۔

(ج) پیداواری تخمینے: ہمارے ہاں جو فی کس آمدنی یا جی ڈی پی کے تخمینے لگائے جاتے ہیں، یہ ترقی یافتہ ممالک کی طرح بالکل یا بہت حد تک درست (Accurate) نہیں ہوتے، کیونکہ ترقی یافتہ ممالک میں معیشت بہت حد تک دستاویزی (Documented)

ہوتی ہے، جبکہ ہمارے جیسے ترقی پذیر یا پسماندہ ممالک میں دستاویزی معیشت کے مقابل اس کے برابر یا زیادہ حجم کی غیر دستاویزی معیشت بھی ہوتی ہے، اس میں ریل اسٹیٹ کا بھی ایک بہت بڑا حصہ ہوتا ہے اور اسی طرح تجارت یا صنعت سے جو آمدنی ٹیکسٹ نیٹ سے بچائی جائے، وہ بھی اسی زیر زمین معیشت کا حصہ ہوتی ہے، اسی کو کالا دھن یا **Black Money** کہا جاتا ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں زرعی پیداوار کے جو تخمینے لگائے جاتے ہیں، یہ بھی حقیقت سے کافی بعید ہوتے ہیں، کیونکہ ان چیزوں کی حقیقی مقدار کو جانچنے کے لیے کوئی جامع اور مؤثر میکانزم نہیں ہوتا، بس ٹاک ٹوئیاں مارتے ہیں۔

(د) حکومتی آمدنی: اس سے مراد مختلف مذاات میں وہ محاصل (Revenues) ہیں جو حکومت اپنے عوام اور کاروباری طبقات سے وصول کرتی ہے، چونکہ ہماری معیشت دستاویزی نہیں ہے، اس لیے اکثر حکومتی ٹیکس بالواسطہ (Indirect) ہوتے ہیں اور ان کا سارا بوجھ عام صارفین پر پڑتا ہے، جیسے جنرل سیلز ٹیکس یا کسٹم ڈیوٹی وغیرہ۔ ہماری حکومتیں بالواسطہ ٹیکسوں پر اس لیے انحصار کرتی ہیں کہ بالائی طبقات یعنی بڑے صنعتکار، تاجروں اور خاص طور پر بڑے زمیندار اور جاگیردار طبقے سے وہ حقیقی براہ راست ٹیکس وصول کرنے میں کلی طور پر ناکام ہیں۔ اس کا ایک سبب یہ ہے کہ یہی مراعات یافتہ طبقات ملک کے حکمران ہوتے ہیں اور اپنی گردن پر چھری چلانے کے لیے کوئی بھی آمادہ نہیں ہوتا، البتہ صنعتکاروں اور تاجروں کے پاس اپنے نفس کو مطمئن کرنے کے لیے دلائل ہوتے ہیں، کیونکہ جو ٹیکس وصول ہوتا ہے، وہ انہی سے ہوتا ہے، تنخواہ دار طبقہ ٹیکس ادا کرنے میں بے اختیار ہے، کیونکہ ان کے پاس گریز کا کوئی راستہ ہی نہیں ہے، سوائے اس کے کہ تحریری ریکارڈ کے بغیر کسی کو تنخواہ مل جائے۔ ٹیکس بالکل نہ دینے والوں یا معمولی دینے والوں میں بڑے بڑے گدی نشین، مڈل کلاس اور لوئر مڈل کلاس کے تاجر بھی ہیں۔

ہماری نظر میں کسی ملک کی اصل قومی آمدنی مندرجہ ذیل عناصر پر مشتمل ہے:

(الف) اجناس، پھلوں، سبزیوں وغیرہ کی صورت میں زرعی آمدنی، نیز جنگلات سے حاصل ہونے والی آمدنی، اگر فی الواقع ایسا ہے، جبکہ بد قسمتی سے ہمارے ملک میں جنگلات کا رقبہ عالمی اوسط کے مقابلے میں بہت کم ہے اور کوئی ایسی قیمتی لکڑی نہیں ہے، جسے اپنی ملکی ضروریات کو پورا کرنے کے بعد برآمد کر کے زرمبادلہ کمایا جائے، ہو سکتا ہے کہ شیشم کی لکڑی سے تیار کردہ کچھ فرنیچر برآمد ہو جاتا ہو، لیکن اس کی مقدار کو بھی معتد بہ نہیں کہا جاسکتا۔ ہماری زرعی اجناس میں سے کپاس اور چاول برآمد کا ایک ذریعہ ہیں، پھلوں میں سے کسی حد تک آم اور کیو وغیرہ ہیں۔ لیکن اس کو بھی ہم عالمی معیار پر ویلیو ایڈڈ نہیں کر پاتے، پروسیسنگ، گریڈنگ اور پیکنگ عالمی معیار کی نہیں ہوتی کہ ہر پیکٹ پر ایکسپورٹ ڈیٹ لکھی ہو۔ سمندر میں سے تاحال ہم کسی حد تک ملکی ضروریات اور برآمد کے لیے مچھلیاں اور جھینگے وغیرہ پر انحصار کر رہے ہیں، ہمیں ان کے بھی حقیقی اعداد و شمار دستیاب نہیں ہیں۔

(ب) زیر زمین اور برسر زمین معدنیات میں سے، جیسے سبب مرمر کی مختلف اقسام، سونا، چاندی، لوہا، پہاڑی نمک، تیل کی مختلف اقسام اور گیس وغیرہ۔ ہم اپنی ضرورت کا ایندھن بھی پیدا نہیں کر پاتے، زیادہ تر پیٹرول، ڈیزل، فرنس آئل اور ایل این جی وغیرہ پر ہمارا انحصار ہے۔ بلوچستان سے سوئی کے مقام پر جو گیس نکالی جاتی ہے، اس کے کنوؤں کی پیداواری استعداد کم ہوتی جا رہی ہے، داخلی بد امنی کے زمانے میں آئے دن گیس کی پائپ لائن کو اڑا دیا جاتا ہے، اس سے گیس کی ترسیل (Supply) کے اخراجات بڑھ جاتے ہیں۔ اب الحمد



لہذا ہماری مسلح افواج نے بلوچستان میں بد امنی پر کافی حد تک قابو پایا ہے، لیکن اس میں کئی طور پر کامیابی کافی مشکل امر ہے، کیونکہ بلوچستان رقبے کے اعتبار سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے اور دشوار گزار بھی ہے، مزید یہ کہ مقامی آبادی کا ایک معمولی حصہ خواستہ (Willingly) اور بڑا حصہ ناخواستہ (Unwillingly) نہ ان سے تعرض کرتا ہے اور نہ ان کی نشاندہی کرتا ہے، اب کہا جا رہا ہے کہ مسلح افواج کے کنٹرول کے سبب لوگوں میں کچھ حوصلہ پیدا ہوا ہے۔ معیشت کے استحکام کا مدار اس پر ہے کہ ہماری برآمدات درآمدات سے زیادہ ہوں یعنی زرمبادلہ کی ادائیگیوں کا توازن ہمارے حق میں ہو، لیکن یہ توازن بہت زیادہ بگڑا ہوا ہے اور فوری طور پر اس خلا کو پر کرنے کے کوئی حالات یا اسباب نہیں ہیں۔ حجم کے اعتبار سے امریکہ کی معیشت دنیا کی سب سے بڑی معیشت ہے، لیکن توازن ادائیگی اس کے حق میں نہیں ہے۔ چین ہی ایک ایسا ملک ہے کہ عالمی منڈیاں اس کی مصنوعات اور اشیا صرف سے بھری پڑی ہیں اور توازن ادائیگی اس کے حق میں ہے اور اس کی معاشی شرح افزائش (Growth Rate) قابل رشک ہے۔ مغربی ممالک نے World Trade Organization قائم کر کے عالمی تجارتی معاہدات اس لیے کیے تھے کہ ان کے مفادات کا تحفظ ہو، لیکن موجودہ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے اسے رد کرنے کا فیصلہ کیا ہے، کیونکہ یہ اب اس کے مفادات کا محافظ نہیں رہا۔ کیونکہ لیبر قوانین کی وجہ سے مغربی ممالک میں صنعتی پیداوار کافی مہنگی پڑتی ہے اور وہ عالمی مارکیٹ میں چین، جاپان اور شمالی کوریا وغیرہ سے مسابقت کی پوزیشن میں نہیں ہوتے۔

ہمارے لبرل اہل مذہب کو کوسے رہتے ہیں، آئیے ان کے سامنے پیرس کی تصویر پیش کریں، یہ ایک اخبار کا ادارتی نوٹ ہے: ”فرانس اور بیلجیئم میں ایندھن کی قیمتوں میں اضافے کے خلاف احتجاج ہو رہا ہے، اس کے نتیجے میں پیرس میدان جنگ بن گیا۔ مظاہرین کو منتشر کرنے کے لیے پولیس نے آنسو گیس پھینکی، مریچوں کا اسپرے کیا، آنسو گیس کے شیل استعمال کیے اور واٹر کیٹین استعمال کیے۔ ان جھڑپوں میں درجنوں لوگ زخمی ہوئے، برسلز میں گاڑیاں نذر آتش کردی گئیں، مجموعی طور پر 1700 افراد گرفتار کیے گئے۔ ایک اطلاع کے مطابق بیلجیئم میں چار سولہ لوگوں نے پارلیمنٹ پر دھاوا بولا اور سو افراد گرفتار ہوئے۔ گرفتار شدگان آتش گیر مادہ لے کر جا رہے تھے تو کیا وہ اس سے سگریٹ سلگاتے، یقیناً تباہی پھیلائی جاتی۔ یہ تہذیب یافتہ ممالک کہلاتے ہیں، ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ لوگ غصہ آنے پر بھی تہذیب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے، غصے کا اظہار بھی تہذیب کے دائرے میں کرتے ہیں۔ پاکستان یا دیگر ترقی پذیر یا پسماندہ ملک کے باشندوں سے یہ لوگ پوچھیں کہ مہنگائی کیا ہوتی ہے، حکومت ایندھن کی قیمتوں میں من مانے اضافے کر دیتی ہے اور یہ چپ چاپ برداشت کر لیتے ہیں۔ الغرض ہمارا میڈیا یورپی اقدار کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان رہتا ہے۔ لیکن اگر پاکستان میں ناموس رسالت ﷺ کے نام پر نکلنے والے کسی جلوس میں کوئی توڑ پھوڑ ہو جائے یا باقاعدہ منصوبہ بندی سے کرادی جائے تو ہمارے لبرل دانشور غیظ و غضب میں آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور ڈائریکٹ اسلام کو ہدف بناتے ہوئے کہتے ہیں: یہ کون سا اسلام ہے۔ مگر آج کسی ٹی وی پر کوئی دانشور یہ سوال نہیں کر رہا کہ یہ کون سی تہذیب ہے۔ احتجاج کرنے والے سرکاری اور نجی املاک کو نقصان پہنچا رہے ہیں، آگ لگا رہے ہیں، حکومت مریچوں کا اسپرے کر رہی ہے، انسانیت، تہذیب، اخلاقیات سب ایک احتجاج میں ہوا ہو گئے، گیس کے شیل پھینکتے ہوئے احتجاج کرنے والوں کی صحت کی کوئی فکر نہیں ہوتی، اس پر احتجاج کرنا روانہ نہیں، کیونکہ بقول شخصے: ”After all یہ مذہب لوگ ہیں۔“